بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

راہ ہدایت کیا ہے؟ اچھی اور بُری زندگی کا معیار کیا ہے؟ خدا پرستانہ زندگی سے کیا نتیجہ معاشرے کو ملتا ہے؟ اور ایک صحت مند، تعمیر پسند مسلم قیادت کی علامت کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ سوالات بڑی تفصیلی بحثیں چاہتے ہیں، اور قرآن کی آیات اور سنت کی روایات ساری کی ساری انہی کا مکمل جواب فراہم کرتی ہے۔

مگر قرآن میں جہاں تفصیل و تشریح کے کمالات ہیں، وہاں ایجاز و اجمال کے بھی اعجاز موجود ہیں۔ ایک ذرا سے سوال پر بھرپور بحث و استدلال کی مثالیں بھی ہیں، اور صدہزار سوالات کو مرتکز کر کے جواب میں کہیں ایک نقطہ رکھ دیا گیا ہے جس پر نگاہیں جمانے سے نکتہ ہائے ایمان و حکمت کے موتیوں سے دامنِ فکر و نظر بھر جاتا ہے۔

اوپر کے سوالات کے جو تفصیلی جواب قرآن نے دیے ہیں، اُن کو سکیڑ سمیٹ کر چند لفظوں میں بھی متعدد مقامات پر، مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ ایسے ہی ایک مقام کی طرف ہم متوجہ ہو رہے ہیں۔

سورۃ النحل کا اصل مضمون یقیناً شرک کا ابطال اور توحید کا اثبات ہے۔ کچھ مباحث اس مضمون کے متعلق ہیں۔ پھر کلام کے بعض حصوں کا تعلق مکے کے آخری دَور (قبل ہجرت) کے مخصوص احوال سے ہے۔

مگر جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ توحید پر مبنی اور اس سے تعلق رکھنے والی بعض دوسری اہم باتیں بھی اس سورہ میں شامل ہیں، مگر ساتھ ہی ساتھ خدائے واحد کی ربوبیت و الٰہیت کی ایک شانِ خاص یعنی ہدایت رسانی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ہدایت کی گفتگو پوری سورہ کے مباحث کی ڈوریوں کے ساتھ گندھی ہوئی چلتی ہے۔ اس کا سرِرشتہ آیت ۲ سے ملتا ہے جس میں ہدایت کے لیے وحی بھیجنے کا ذکر ہے۔ پھر

آیت ۹ میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت بہم پہنچانا یا سیدھا راستہ دکھانا اللہ کے ذمے ہے۔ بیچ میں جگہ جگہ یہ مضمون جھلکیاں دکھاتا ہوا آیت ۹۰ میں پورے اُبھار پہ آجاتا ہے۔ ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔ اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔"

پھر یہ مضمون آیت ۹۷ میں چاند کی طرح چمک اُٹھتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ،

"جو شخص بھی نیک عمل کرے گا (عملِ صالح کا اصولی خاکہ اُوپر دیا جا چکا ہے) خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اُسے ہم دُنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے۔"

یہ اصولی بات دوسرے مقامات پر بھی ملتی ہے۔ مگر جس زور کے ساتھ اور جس انداز میں اس مقام پہ ہے، اس کے رُو سے مخاطب کو فوری تاثر یہ ملتا ہے کہ حیاتِ طیبہ کا دارو مدار اعمالِ صالحہ پہ ہے، یا آیت کی ترتیبِ کلمات کے مطابق کلیہ یہ ہوا کہ ہر وہ شخص (یا معاشرہ) جو بحالتِ ایمان اعمالِ صالحہ پہ کاربند ہو گا۔ اُسے "حیاتِ طیبہ" کی نعمتِ گراں بہا حاصل ہو گی۔ میرے نزدیک یہ آیت سورہ النحل کی عمارت کا منارہ ہے۔

اب ان دونوں آیات کی تھوڑی سی تشریح بھی سامنے رکھ لیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ ... الخ کے متعلق ابن کثیر کے ہاں ایک روایت کا حوالہ ہے جس کی رُو سے اکثم بن صَیفی کے بھیجے ہوئے دو قاصد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اکثم نے آپؐ سے دریافت کیا ہے کہ آپ کون ہیں؟ اور آپ کیا ہیں؟ جواباً حضورؐ نے فرمایا، "فامّا من انا؟ فانا محمّد بن عبداللہ - وامّا ما انا؟ فانا عبدُ اللہ ورسولُہٗ"۔ یعنی یہ سوال کہ میں کون ہوں تو میں محمدؐ بن عبداللہ ہوں، اور دوسرا سوال کہ میں کیا ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے متذکرہ آیت پڑھی: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ...... الخ۔ قاصدوں نے اکثم کو پیغام پہنچایا۔ سُن کر اس نے کہا میرا تاثر یہ ہے کہ وہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور پستیٔ اخلاق سے روکتا ہے۔ پس تم لوگ اس کام (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک میں) پیش رَو بنو، نہ کہ صفِ آخر کے لوگ۔ اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضورؐ کی نگاہ میں کتنی بڑی اہمیت تھی اس آیت کی، جسے آپ نے بہ حیثیت اپنے پیغامِ رسالت

کے بیان فرمایا۔

اس آیت پر تفہیم القرآن کا تشریحی نوٹ ملاحظہ ہو:۔

اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار ہے۔

"پہلی چیز عدل ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے۔ اُردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ "انصاف" سے ادا کیا جاتا ہے۔ مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو۔ پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افرادِ معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے، مثلاً حقوقِ شہریت میں۔ مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل عدل کے خلاف ہے مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی و اخلاقی مساوات، اور اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کمتر درجے کی خدمت کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن و تناسب ہے اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری سے ادا کیے جائیں۔

دوسری چیز احسان ہے جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا، اور خود اپنے حق سے کم پر راضی ہو جانا۔ یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر

کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اُسے وصول کر کے چھوڑے، اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اُسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ایک ٹھنڈے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہوگی، مگر محبت اور شکر گزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور محاسن کو نشوونما دینے والی قدریں ہیں۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے، صلۂ رحمی ہے جو رشتہ داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت معین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں اُن کا شریکِ حال ہو اور جائز حدود کے اندر اُن کا حامی و مددگار بنے، بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحبِ استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ شریعتِ الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہے اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصرِ ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوشحال افراد پر ہے، پھر دوسروں پر اُن کے حقوق عاید ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اوّلین حقدار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے اور اس کے بھائی بہن ہیں۔ پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں اور پھر وہ جو اُن کے بعد قریب تر ہوں۔ اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار ہوں۔ اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا ——— اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (UNIT) اس طرح

اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوشحالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو گی"۔

آیت کے دوسرے حصے کے متعلق بھی ذیل کی توضیح بصیرت افروز ہے:

"اوپر کی تین بھلائیوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین برائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو، اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں۔

پہلی چیز فحشاء ہے جس کا اطلاق تمام بیہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فحش ہے، مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عریانی، عملِ قومِ لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا، اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز منکر ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں۔ اور تمام شرائعِ الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

تیسری چیز بغی ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے"۔

تین مثبت اصولوں کے قیام اور تین منفی و تخریبی عوامل کے سدباب کا یہ فرمان دراصل اسلام کا مختصر منشور ہے۔ اس منشور کی اساس پر جو شخص یا جو معاشرہ اپنی زندگی استوار کرے گا، وہی ان نتائجِ حسنہ کو پا سکتا ہے جن کی بشارت دینے والا اسلام ہے۔

اسی منشورِ فلاح کو پس منظر میں رکھ کر قرآنی آیت " فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً " کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی جو لوگ خدا کے امر کردہ اور نہی کردہ امور کو ملحوظ رکھ کر بحالتِ ایمان عملِ صالح کریں گے وہ اُن کو پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی سعادت دے گا۔

یہاں "حیٰوۃ طیبہ" سے مراد عیش و عشرت کی زندگی نہیں ہے، بلکہ ایسی زندگی جو بدباطنی سے پاک ہو اور جسے معصیت کے زخم نہ آئے ہوں، ظلم اور ہوسناکی نے ایسے کانٹے نہ بو دیے ہوں کہ آدمی ہزار تنعم کے باوجود سکون نہ پا سکے، وہ اپنی نگاہوں میں مجرم بنا رہے اور ضمیر کی عدالت میں وہ حزن و ملال

کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہر روز .... اپنے اعمال بد کا بوجھ اُٹھائے پیش ہوتا ہو اور خداوند تعالیٰ کے سامنے ذلیل و رسوا ہوتا ہو۔

حیاتِ طیبہ جس کی بشارت ایمان و عمل صالح سے آراستہ لوگوں کو دی جا رہی ہے، اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے شاید تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنا خاصا ممد ہوگا۔

سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۲۴ میں فرمایا گیا ہے کہ:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ	اور جو میرے ذکر (درسِ نصیحت) سے
فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا	منہ موڑے گا اس کے لیے دُنیا میں تنگ
.... الخ	زندگی ہوگی۔

اس آیت کی اصطلاح معیشۃً ضنکاً پر تفہیم القرآن کا مختصر توضیحی نوٹ یہ ہے:

"دُنیا میں تنگ زندگی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اُسے تنگ دستی لاحق ہوگی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اُسے چین نصیب نہ ہوگا۔ کروڑ پتی بھی ہوگا تو بے چین رہے گا۔ ہفت اقلیم کا فرماں روا بھی ہوگا تو بے کلی اور بے اطمینانی سے نجات نہ پائے گا۔ اس کی دُنیوی کامیابیاں ہزاروں قسم کی ناجائز تدبیروں کا نتیجہ ہوں گی جن کی وجہ سے اپنے ضمیر سے لے کر گرد و پیش کے پورے اجتماعی ماحول تک ہر چیز کے ساتھ اس کی پیہم کشمکش جاری رہے گی، جو اُسے کبھی امن و اطمینان اور سچی مسرت سے بہرہ مند نہ ہونے دے گی[۱]۔"

اب آپ "حیوٰۃ طیبہ" کے بالمقابل "معیشۃً ضنکاً" کو رکھ کر دونوں کا مفہوم بآسانی متعین کر سکتے ہیں۔

---

[۱] اس وقت کی پوری ماڈرن دُنیا میں آپ ایک ایک شخص کو "مَعِيْشَةً ضَنْكًا" کا عبرت ناک نمونہ دیکھیں گے ہر طرف خوف، ہر طرف نفرت، ہر طرف تشدد، ہر کوئی بے ہمدم و محرم، نہ دوسروں پر اعتماد، نہ اپنے آپ پر اعتماد، ہر کوئی بے سکون! کوئی حقوق کی لڑائی لڑ رہا ہے جو کہیں ختم نہیں ہوتی۔ کوئی چھاپہ مار بن رہا ہے، کوئی ہیپی ازم اختیار کر رہا ہے، کوئی گھٹیا نشوں میں سکون و راحت تلاش کر رہا ہے۔ کوئی خودکشی کو واحد حل سمجھتا ہے۔ اتنی دولت، اتنے فلسفے، اتنی آسائشیں، اتنی تفریحات —— اور پھر یہ عالمگیر اضطراب! (ا۔ ج)

فی الحقیقت انسانی بے چینیوں اور اضطراب کا بنیادی سبب حالتِ خوف کا موجود رہنا ہے۔ خوف جس کی کئی اقسام ہیں، ایک آسیب کی طرح انسان کے ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے۔ اور وہ اُسے امن و سکون سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن نے اسی حالت کو انسانی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت اور اس کے مقابلے میں حالت امن (معاشرتی اور ذہنی) کو سب سے بڑی نعمت کی حیثیت دیتے ہوئے اہلِ ایمان کو عملِ صالح کے نتیجے میں حاصل ہونے والی خلافت کا ماحصل یہ بتایا ہے کہ:

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا ۚ (النور - ۵۵)

اور (اللہ تعالیٰ) اُن کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن (کی حالت) سے بدل دے گا۔[۱]

اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط بات نہ ہوگی کہ پہلے ہم جو بات اس شکل میں بیان کر چکے ہیں کہ اسلام انسان کو معیشۃً ضنکاً سے نجات دلا کر اُسے حیات طیبہ کے مقام تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہی بات یہاں اور بھی زیادہ ایجاز سے بیان کی گئی ہے۔ یعنی حالتِ خوف کو حالتِ امن سے بدل دینا مقصودِ دین ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک ہی مفہوم رکھتی ہیں۔

اب گویا ایک مسلم معاشرے، اس کی حکومت اور اس کی قیادت کے لیے ذمہ داری کا سیدھا راستہ واضح اور متعین ہو گیا۔ اس کی تمام تر مساعی کا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ خدا کی ہدایت کے مطابق تعلیمی، معاشی اور قانونی ذرائع سے کام لے کر ایک ایک فرد کو معیشۃً ضنکاً کے عذاب سے نکالے اور حیوٰۃ طیبہ کے مقام تک پہنچائے۔

(باقی بر صفحہ ۴۸)

---

[۱] قرآن میں "خوف" کے ساتھ دوسرا لفظ "حزن" بھی متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (البقرہ - ۲۶۲) لیکن حزن دراصل ان چیزوں کے واقع ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے جن کا خوف بیشتر سے لاحق ہوتا ہے۔ لہٰذا حزن بھی خوف کے تحت آئے گا۔ چند مقامات پر خوف کے ساتھ لفظ جوع بھی مذکور ہے۔ اس صورت میں بھی معاملہ حزن ہی کا سا ہے، یعنی محرومیِ رزق جن وجوہ سے نمودار اور مسلط ہوتی ہے، انسان پہلے سے اُن کے خوف کی زد میں ہوتا ہے پس جامع تصور خوف ہی کا ہے، چاہے وہ قتل کا خوف ہو، ذلت کا ہو، محرومیِ حق کا ہو یا تنگدستی کا۔ (ن - ص)